مترجم
پروفیسر وائی ایس طاہر علی

دوسری قسط

ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کی کتاب،

الموسوم بہ،

فارسی شاعری کے ارتقاء میں عربی شاعری کا ہاتھ

باب دوم

عربی شاعری اور اس کا ارتقاء

ہم نے دیکھا کہ ایران میں اسلام کے آنے سے پہلے شاعری کا وجود تھا اور پھر اس شاعری کے مفقود ہونے کا سبب قدیم ایرانی فاضلوں کی بے اتفاقی اور ذرائع ابلاغ کی کمی تھی۔ مثال کے طور پر ان کے ہاں راویوں کا سلسلہ نہ تھا جو ان کے شعر و سخن کو دوام عطا کرتا جیسا کہ عرب راویوں نے عربی شاعری کو عطا کیا تھا۔ قدیم ترین شعر جو فارسی میں ملتا ہے، وہ مسلمانوں کے زمانے کا ہے اور وہ بھی دو صدیاں گزر جانے کے بعد کا، جب کہ عربی میں شعر و سخن کا بازار گرم تھا۔ اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ اس تمام عرصے میں اہلِ ایران عربی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ عربی زبان اور اس کی ادبیات کا دائرہ علماء تک محدود تھا، ورنہ عوام میں تو ان کی دیسی زبان ہی مروج تھی۔ ایرانی دراصل اپنی زبان کو غیر زبانوں کے الفاظ سے پاک رکھنا چاہتے تھے، اسی لیے انھوں

نے یمن سے اپنے گورنر خُرّہ خسرو[۵۱] کو ایران واپس بلالیا کیونکہ اس نے خود کو عربوں کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہ شخص رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن کا حاکم تھا ہم استشہاد کے لیے مشہور نحوی ابن جنی (۳۳۰ تا ۳۹۲ھ) کو پیش کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ایرانی اپنی زبان میں عربی الفاظ کا لانا گوارا نہیں کرتے تھے اور وہ ان شعراء کی تنقیص کیا کرتے تھے جو اپنے کلام میں عربی کے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے[۵۲] درحقیقت ایران میں عربی رائج ہونے میں بڑی دیر لگی۔ بالخصوص بخارا اور سمرقند میں تو بڑی لمبی مدت تک عربی نہ پھیل سکی کیونکہ یہاں دین اسلام سے بڑی مخالفت رہی۔ فاتحین نے مخالف گروہ کو مشرف بہ اسلام

۵۱۔ پروفیسر براؤن: تاریخ ادبیات ایران جلد ۱ صفحہ ۲۶۲ اور ذیلی حاشیہ ۲؎

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عربستان سے میل جول ہونے کی بنا پر بہت سے عربی الفاظ فارسی میں در آئے ہوں گے۔ دراصل ایک مدت سے پہلوی زبان میں سامی الفاظ آنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کو ہُزوَرش کہا جاتا تھا، (ملاحظہ ہو، پروفیسر براؤن: تاریخ ادبیات ایران، جلد ۱)۔ عربی اور فارسی کے باہمی اثرات حیرہ میں نمایاں تھے جو ایک درمیانی سلطنت تھی۔ بہرام گور نے لخمی خاندان کے نعمان اور منذر سوئم کے زیر سایہ تربیت حاصل کی تھی اور ان دو زبانوں کے علاوہ وہ عبرانی، ہندی، ہَروی، نَبطی اور یونانی زبانوں سے بھی واقف تھا (ملاحظہ ہو ثعالبی: غُرَر صفحات ۵۴۲ تا ۵۴۳ اور پروفیسر براؤن: تاریخ ادبیات ایران جلد ۱ صفحہ اور ذیلی حاشیہ ۲؎) ایرانی امراء کو یہ شکایت تھی کہ بہرام گور اپنی حرکات وسکنات میں عرب معلوم ہوتا تھا (پروفیسر نکلسن: عربوں کی تاریخ ادبی صفحہ ۴۱ اور ذیلی حاشیہ ۲؎، طبری: جلد ۱ صفحہ ۸۵۸، ۷)۔ شاعر عدی اور اس کا بیٹا زید ایرانی دربار میں ترجمان کا کام سرانجام دیتے تھے۔

۵۲۔ کتاب الخصائص، صفحات ۲۵۱ تا ۲۵۲ (قاہرہ، ۱۳۳۱ھ) "ایرانی اپنی زبان کے دلدادہ تھے اور اسی میں لکھا کرتے تھے۔ وہ عربی الفاظ کے استعمال کو ناپسند کرتے تھے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اگر شاعر ایسا شعر کہے جس میں عربی الفاظ ہوں تو وہ ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے اور اسے اپنی تنقید کا ہدف بناتے تھے"

کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ان کے افراد کو جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے انعام و اکرام بھی دیئے اور ان کو اجازت دی کہ وہ قرآن پاک کا فارسی ترجمہ ہی پڑھیں اور سمجھیں[1] یہ بھی ملحوظ رہے کہ عمر بن الخطابؓ (۶۳۴ء تا ۶۴۴ء) کے عہد سے لے کر اموی خلیفہ عبدالملک (۶۹۵ء تا ۷۰۵ء) کے وقت تک سرکاری حساب کتاب فارسی زبان میں ہوا کرتا تھا۔ مؤخر الذکر نے عربی کو عام زبان بنانے کے لیے جان توڑ کوشش کی۔ جب عرب سلطنت کا استحکام ہوا اور حالات نے پلٹا کھایا تو ایرانیوں نے عربی زبان پر عبور حاصل کرنے میں کچھ زیادہ دلچسپی لی۔ علاوہ اس کے، عربی کی ترویج کا ایک دوسرا سبب یہ تھا کہ جن شعراء کو اپنے عرب والیوں سے انعام و اکرام وصول کرنا مقصود ہوتا تھا وہ لازمی طور پر ان کے لیے قصائد عربی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ عربی میں دستگاہ حاصل کرنے میں وہ اپنے اساتذہ سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے اور ادبیات کے ہر شعبہ میں ان سے بازی لے گئے، حتیٰ کہ شاعری میں بھی، جو کہ عربوں کی خاص جولان گاہ تھی۔ انھوں نے نہ صرف ان کے اسالیب کو اپنایا بلکہ ان میں نئے نئے انداز فکر اور جدتِ خیال اختیار کیے جو قدیم عرب شعراء کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ اس بدلی ہوئی عربی شاعری میں بدوی گیتوں کی گونج پھر بھی باقی رہی اور ایران میں ابھرنے والی شاعری نے اسی سے فیضان پایا۔

ہم ان فضلاء[2] کے ساتھ ہم نوا نہیں ہیں جو عرب نحویوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عربوں کی اصل شاعری بدوی شاعر ذوالرمہ (متوفی ۷۳۵ء) پر ختم ہو گئی۔ نیز یہ کہ عہد عباسیہ کی شاعری زبان کے اعتبار سے عربی تھی مگر خیالات میں اور تشبیہ و استعارہ کے لحاظ سے ایرانی تھی، فون کریمر کی رائے اس معاملے میں زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے، ابو فراس (متوفی ۹۶۸ء) کے بارے میں لکھتے ہوئے، وہ کہتا ہے:

---

[1] ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ: اسلام کی تبلیغ۔ صفحہ ۲۱۳

[2] ان فضلاء میں جو اس خیال کے حامی ہیں ہم صرف ڈاکٹر ویل کو اور سر چارلس لائل کو پیش کرتے ہیں۔ Litt. Der ARABER P.81 اور ANCIENT ARABIAN POETRY P.33

"عربی شاعری کی داخلی تاریخ بے شک اس شاعر پر ختم ہوجاتی،
اگر اس سے بڑھ کر نابغۂ زمان یعنی المعرّی پیدا نہ ہوا ہوتا۔ اس نے
فلسفیانہ خیالات اور نظریات کو جس کی ابتدا ابوالعتاہیہ سے ہوئی
تھی ایک نیا انداز بخشا"[1]

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ قدماء کسی نقطۂ نظر سے محدثین پر فوقیت رکھتے ہیں[2] قدماء کو تو صرف یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے شعر و شاعری میں اوّلیت پائی جب کہ شعر و سخن کی زمین ناہموار تھی۔

ترقی پسند خیالات کی طرح شاعری بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور وہ خود کو نئے حالات کے مطابق ڈھالتی ہے۔ وہ کسی خاص عہد کی ملکیت نہیں ہے۔ جب تک انسان میں قوتِ متخیلہ موجود ہے، شاعری کا ہونا ضروری ہے۔ ابو تمام نے کہا ہے[3] ؎

لہ Culturgeschichte des ORIENTS ج۲ ص ۳۸۶ ترجمہ پروفیسر براؤن: تاریخ ادبیات ایران ج ۱ ص ۳۷۱

سلہ یہ بڑی دلچسپ بحث ہے کہ "کیا قدماء محدثین پر فائق ہیں؟" اس کے لیے ملاحظہ ہو ابن قتیبہ صفحہ ۵ و ۶۔ ابن رشیق: العمدہ جلد ۱ صفحات ۵۶ و ۵۷ اور ابن الاثیر: المثل السائر صفحات ۴۸۹ و ۴۹۰۔ مؤخر الذکر نے قدیم نحاۃ کے وضع کردہ تنقیدی اصول کی دھجیاں اڑائی ہیں اور ان کے ذوق کی صحت پر اس کو بہت شک ہے۔ اس مسئلے کا گولڈزیہر نے بڑی قابلیت سے اپنی کتاب "ALTE und NEUE POESIE im URTHEILE der Arabischen KRITIKER" میں جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر نکلسن کی کتاب LIT. HIST صفحات ۲۸۶ تا ۲۸۸ اور ان کی Studies in Islamic Poetry صفحات ۴۸ اور ۴۹ بھی ملاحظہ ہو۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ عرب شعراء کے کلام کو تدوین کرنے والوں مثلاً ثعالبی نے یتیمہ میں، باخرزی نے دمیہ میں، عماد الدین الاصفہانی نے خریدہ میں اور صدرالدین المدنی نے سلافہ میں، اپنے ہم عصر شعراء کی بہت تعریف کی ہے اور اپنے اپنے عہد کو زرّین قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ شعراء اپنے متقدمین پر شیریں بیانی اور ندرتِ خیال کی وجہ سے بہت فائق ہیں۔ سلہ دیوان صفحہ ۴۲ سطر ۱۰ اور العمدہ جلد ۱ صفحہ ۵۷

فلو کان یفنی الشعر افناه ماقرت حیاضك منه فی العصور الذواهب

ولکنه صوب العقول اذا انجلت سحائب منه اعقبت بسحائب

(اگر شعر و سخن کا خاتمہ ہو تو یقیناً جو کچھ تمھارے حوضوں میں گزشتہ وقت کا جمع کیا ہوا ہے وہ فنا ہو جائے گا[1]۔ لیکن وہ تو عقل کی بارش ہے۔ اگر چند بادل ہٹ جائیں تو ان کی جگہ پر دوسرے بادل چھا جاتے ہیں)۔

درحقیقت ایسے شاعروں کی کوئی کمی نہیں جو خود کو قدماء پر فائق سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر متنبی[2] کہتا ہے ؎

ما نال اهل الجاهلية كلهم شعری وما سمعت بسحری بابل

(جاہلیت کے شعراء میری شاعری کی گرد تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور اہل بابل کو بھی میری جادو بیانی نصیب نہ ہوئی)

یا معرّی کی اس شیخی کو بہت کم لوگ نظرِ استحسان سے دیکھیں گے ؎

وانی وان كنت الاخير زمانه لآت بما لم تستطعه الاوائل

(اگرچہ میں زمانے کے لحاظ سے سب سے آخر میں آیا ہوں، لیکن میں نے وہ کام کر دکھایا ہے جو اگلوں سے نہ ہو سکا)۔

اب ہم ان تبدیلیوں کا جائزہ لیں گے جو عربی شاعری میں عہد بنی عباس تک رونما ہوئی ہیں اور ان نئے خیالات کا سُراغ بھی لگائیں گے جو بیرونی ثقافت کے میل جول سے پیدا ہوئے ہیں۔

قدیم کلاسیکل شاعری، مضامین کے لحاظ سے گوناگوں معلوم ہوتی ہے، نہ کہ اسالیب کی رُو سے۔ قصیدے کو لیجیے یا قطعے کو یا مرثیے کو، یہ سب اپنی ساخت میں ایک جیسے ہیں،

---

[1] "جو کچھ تمھارے حوضوں" سے مراد ہے کہ جو کچھ تمھاری تعریف میں اور تمھارے اگلوں کی تعریف میں کہا گیا ہے (ما قیل فیك و فی سلفك)۔ صفحہ ۹۷، رسالہ الغفران مخطوط در ملک پروفیسر نکلسن اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا اکتوبر ۱۹۰۰ء والا مجلّہ۔

[2] عکبری جلد ۲ صفحہ ۱۸۶

[3] پروفیسر نکلسن: STUDIES صفحہ ۱۴۹

لیکن موضوعات کی بناء پر ان میں تنوع پیدا ہوتا ہے۔ مضامین کی بناء پر ذیل میں عربی شاعری کی درجہ بندی کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے :-

(الف) **النسیب** : یہ قصیدے کا یا مدح کا پہلا حصہ ہے جس میں شاعر اپنے جذبات کو قلم بند کرتا ہے اور اپنی محبوبہ کی اُلفت کا بیان کرتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں اس کا درجہ بہت بلند مانا گیا ہے۔

(ب) **الفخر یا الحماسہ** : اس میں شاعر اپنی خودستائی اور خودبینی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے خاندان پر ناز کرتا ہے اور اپنے بزرگوں اور قبیلے کی شجاعت و بہادری کے قصے بیان کرتا ہے۔

(ج) **الھجاء** : اس میں شاعر اپنے دشمنوں کی ہجو لکھتا ہے اور اپنے قبیلے کے دشمنوں کی دشنام طرازی کرتا ہے۔ عہد بنی امیہ میں ہجویہ کلام ایک سیاسی ہتھیار تھا جو زمانۂ حال کی صحافت کا کام دیتا تھا۔

(د) **الرّثاء** : اس میں شاعر کسی مرنے والے کی خوبیاں لکھتا ہے۔ اگر قبیلے والوں نے کسی متوفّی کا ناروا خون بہایا ہے تو شاعر اپنے لوگوں کو غیظ و غضب کے اشعار کہہ کر متوفی کا انتقام لینے کے لیے ابھارتا ہے۔ عموماً مقتول پر نوحہ و بُکا کرنے کا کام عورتوں کے سپرد ہوتا تھا کیونکہ انہیں اظہارِ غم میں مہارت تھی۔ عورتیں ان جوانا مرگ کی قبروں کو یاد کرتی تھیں، جن پر صبح گاہی بادل برس کر سبزہ اُگاتا ہے، یا انسان کی دَوروزہ زندگانی کو بیان کرتی تھیں جو صحرا کی اڑتی ہوئی ریگ کے مانند ہوتی ہے، یا ان دُمدار ستاروں کے مانند ہوتی ہے جو آسمان میں چمکتے ہیں اور ایک آن میں فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مقتول نہ رہا مگر یہ جہاں یوں ہی رہے گا، سورج، چاند اور ستارے اپنے اپنے وقت پر طلوع و غروب ہوتے رہیں گے اور پہاڑوں کی سربفلک چوٹیاں بھی اپنی جگہ پر قائم رہیں گی۔

(ھ) **المدیح** : یہ وہ قصائد ہیں جن میں شاعر کسی سردارِ قبیلہ کی سخاوت اور دلیری کی اور دیگر اوصاف کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے اپنے قبیلے والوں کی وقتِ مصیبت مدد کی ہے۔ ایک مدّت کے بعد اس صنفِ شاعری نے امیروں کی خوشامد کا کام شروع کر دیا۔

(و) **الاعتذار** (یا معذرت نامہ) : اس میں شاعر جب اپنے ممدوح کا کسی فرضی یا بے بنیاد الزام کی وجہ سے معتوب ہوتا ہے تو وہ قسمیں کھاتا ہے اور اپنی بے گناہی کو ثابت کرتا ہے۔ اس صنف میں "نابغہ" کی بڑی ممتاز حیثیت ہے اور عہدِ اسلام میں اس کی نظیر البحتری میں ملتی ہے[۱]۔ معذرت خواہی میں اور مرثیہ نگاری میں ایرانی شعراء کو عرب شعراء کے ساتھ ہمسری کرنا ممکن نہ تھا، کیونکہ یہ چیزیں اسلام نے ممنوع کر دی تھیں۔

(ز) **الوصف یا بیانیہ شاعری** : اس کا دائرہ النسیب کے مانند وسیع ہے، اس میں شاعر ریگستان کی منظر کشی کرتا ہے۔ وہ اس کی بھیانک ویرانیاں، سراب کی دھوکہ بازی منطقۂ حارہ میں آسمان پر ستاروں کی جلوہ افگنی، ہلاکت خیز زندگانی اور شجاعت کے رومانوی قصے، راتوں کے سفر، جنگلوں میں آورگی، لڑائیاں اور صحرائی زندگی کی دیگر باتیں بیان کرتا ہے۔

(ح) **المثل یا الحکم** : یہ حکمت و دانائی سے لبریز اشعار ہوتے ہیں، جن میں اخلاق کی بنیادی باتیں ہوتی ہیں اور حکمتِ عملی کے راز ہوتے ہیں[۲]۔

قصیدہ میں جو کہ صحراء (عرب) کی پیداوار ہے، یہ تمام موضوعات مل سکتے ہیں قصیدے نے اسلام کی آئندہ شاعری پہ بے پناہ اثر دکھایا ہے۔ اس کے شروع میں ہموارہ ایک جانا بُوجھا منظر ہوتا ہے جس میں شاعر اپنی محبوبہ کے ویران مسکن پر کھڑا ہوا اپنی یادوں کی برات میں متفکر نظر آتا ہے۔ کچھ وقت کے لیے وہ ان متضاد خیالات میں مگن رہتا ہے اور پھر اپنی حالیہ حقیقت سے چونک کر، ایک قوی الجثہ اونٹ پر سواری کرتا ہے اور اس مسکن کو خیرباد کہتا ہے۔ اس قصیدے میں وہ اپنے اونٹ کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی

---

[۱] العسکری : دیوان المعانی۔ صفحہ ۲۶ ب۔

[۲] متأخرین نے عہدِ اسلام میں اس فہرست میں کچھ اور مضامین کا اضافہ کیا ہے، مثلاً زُھدیّات (مذہبی اشعار)، خمریّات (شراب نوشی کے اشعار)، طردیّات (شکار کے اشعار) اور اِخوانیات یعنی یار باشی کے اشعار۔

شجاعت اور مردانگی کا تذکرہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے اپنے سفر میں درپیش تکالیف کا سامنا کیا ہے۔ آخر میں وہ اپنے قبیلے کی یا اپنے ممدوح کی فیاضی کی تعریف میں چند اشعار کہتا ہے یا آنے والے حوادث کو بیان کرتا ہے اور پھر موسلا دھار بارش کا ذکر کرتا ہے، جس سے اس کے برانگیختہ جذبات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات اپنے قصیدے کو وہ پُرمغز حکمت و دانائی کے جملوں سے ختم کرتا ہے[1]

جاہلیت کی شاعری کے تین پُرزور عناصر تھے :

(الف) جنگی کارناموں کی تعریف و توصیف۔

(ب) مہمان نوازی اور فیاضی کی مدح سرائی۔

یہ دونوں باتیں بادیہ نشینوں کے لیے بیش بہا دولت تھیں۔ اور

(ج) داستانِ عشق۔

یہ تو اِن تینوں عناصر میں سب سے زیادہ بار آور عنصر تھا۔ اس کی وجہ سے عربی ادبیات میں بہترین نظموں نے جنم لیا۔ اس کی بدولت شاعر اپنے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور جو کچھ اس کے دل میں شعلہ زن ہے اس کو شعر میں بیان کرتا ہے۔

اُس غیر ترقی یافتہ زمانے کی بہت سی نظمیں ہم کو ملی ہیں جن میں عورتیں ہی مردوں کو اپنے عشق میں گرفتار کرتی تھیں کیونکہ عورتیں مردوں کی غلامی سے اس وقت تک آزاد تھیں۔ اس کے بعد مذہبی پابندیوں نے عورتوں کی آزادی کو سلب کرلیا اور عورتوں کے پاس سوائے اس کے ذاتی حُسن کے کچھ نہ رہا تو عربی شاعری میں شہوت انگیز باتیں پیدا ہونے لگیں جو موجودہ وقت کے لوگوں کے مزاج کے بالکل منافی ہیں اور جو مہذب خیالات سے متضاد ہیں[2]

---

[1] ایک مثالی قصیدے کے ڈھانچے کے لیے ملاحظہ ہو :۔ دی سلین : دیباچہ ترجمہ ابن خلکان صفحہ ۲۳ جو کم و بیش امرء القیس کے قصیدے کا تجزیہ ہے۔ مزید ملاحظہ ہو :۔ پروفیسر نکلسن، تاریخ ادبیات صفحات ۷۷ تا ۷۹۔

[2] ڈاکٹر دِیل، DIE POETISCHE LITRATUR der Araber صفحات ۳۰، ۳۱ اور ۸۰۔

نہ صرف یہ بلکہ ایرانی ماحول کے مُخرّب اخلاق اثرات کی وجہ سے عشق محض کو غیر فطری رنگ دے دیا گیا ہے۔ قدیم عربی شاعری کا سادہ پن اور اس کی حقیقت پسندی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ شعراء نے یا افتادہ الفاظ اور محاورات کا استعمال شروع کر دیا جو شاعری کا مایۂ ناز سرمایہ ہونے لگا اور شعراء نے اس میں وہ بھرمار کی کہ دم گھٹنے لگا۔

سچ ہے کہ شعر و سخن میں عربوں کے اخلاق قلمبند ہوئے ہیں۔ شعر و سخن ہی سے ان کی زندگی کا تانا بانا بنتا ہے۔ کوئی بھی واقعہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو ان کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا اور اس کی وجہ سے ان کو شعر گوئی کا موقعہ ملتا تھا۔ ہر بات کو وہ شعر و سخن سے بقائے دوام دے دیتے تھے، خواہ وہ جنگ ہو یا کامیابی، بلائے ناگہانی ہو یا قصاص، محبوبہ ہو یا کوئی مہمان، جود و سخا ہو یا پھر اُونٹنی کے بچہ کی ولادت۔ اسی سے ہم اتنی طویل مدت کے بعد، ان کے ماحول کو، ان کے رُسوم و عادات کو اور ان کی ذہنیت کو سمجھ پاتے ہیں[1] اُس میں ماورائے ادراک فلسفہ یا فرضی قصے اور روایتیں نہیں ہوتی تھیں۔ جو اپنی رنگا رنگی اور چمک دمک سے پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں، اس میں تو زندگی اور فطرت کی صحیح عکاسی ہے۔ جو محدود ہوتے ہوئے بھی عظیم الشان نظر آتی ہے[2] اس میں تازگی ہے، رونق ہے اور صحرائی گیتوں کی عظمت ہے، وہ پُرتاثیر ہے اور مردانگی و جاں بازی سے لبریز ہے۔

ظہورِ اسلام کے ساتھ تغیر و تبدل رونما ہو گیا۔ عربوں کی اجتماعی حالت میں انقلاب آیا اور فرسودہ نظریات کے بجائے نئے نصب العین وجود میں آئے[3] کچھ وقت کے لیے عربوں کے سامنے بہتر مشاغل تھے بمقابلہ شعر گوئی کے، جس سے عشق و محبت یا بُغض و عداوت کے جذبات اُبھارے جاتے تھے۔ ان کے دلوں میں اسلام کی خاطر اور خدا کی خاطر تسخیرِ عالم کا جذبہ موجزن تھا

---

[1] ڈاکٹر ویل: ایضاً صفحہ ۴۶

[2] نولدیکے: BEITRÄGE ZUR KENNTNISS der POESIE DER ALTEN ARABER صفحات ۳۲

اور لائیل: قدیم عرب شاعری، صفحہ ۱۸

[3] گولڈزیہر: MUH. STUD، جلد ۱ باب اول (مروّة)

وہ قرآن کو کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے سیکھتے تھے، اسے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے اور اُسے ازبر کرتے تھے۔ گرچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعری سے گریز کرنے کے لیے کوئی واضح حکم صادر نہیں فرمایا تھا لیکن اس کی ترقی میں رُکاوٹ حائل ہوگئی تھی۔ عہد بنی امیہ میں تمام حکمران باستثنائے عمر بن عبدالعزیز، مذہب کے معاملے میں چُست نہیں تھے، لہٰذا جاہلیت کی باتوں نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا۔ پہلی صدی ہجری کے مشاہیر شعراء میں فرزدق، جریر، اخطل، اور ذوالرمہ شمار ہوتے ہیں، انھوں نے جاہلیت کے شعراء کی روایتوں پر عمل کیا۔ اور نہ صرف ان کے حوالے دیئے بلکہ ان کے شعر وسخن کے سرمایہ کو بار بار دُھرایا۔ بعض اوقات تو مضامین پر یکساں طور پر کام ہوا۔ ان پر کچھ کچھ اضافے بھی کیے گئے یا کہیں کہیں کاٹ چھانٹ کی گئی اور اور اُن کو اپنی اپنی جگہ پر چسپاں کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ انھوں نے ان کی روایات کو برقرار رکھا[1] بایں ہمہ اس عہد میں تبدیلی کے آثار نمایاں ہوئے،[2] جو عہد بنی عباس میں بہت شدّومد کے ساتھ وقوع پذیر ہوئے۔

---

[1] لایل: دیوان عبید بن الابرص و دیوان عامر بن الطفیل۔ دیباچہ، صفحہ ۱۲

[2] یہ تبدیلی لوگوں کے طرزِ معاشرت کے بدل جانے سے پیدا ہوئی، گولڈزیہر نے اس پر اپنی کتاب "ALTE UND NEUE POESIE" میں بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قصیدہ میں صحرائی زندگی کی روایات برقرار تھیں لہٰذا وہ شہری زندگی کے ساتھ غیر فطری معلوم ہونے لگیں کیونکہ شعراء دارالحکومت یا دارالخلافت کی طرف رُخ کرنے لگے تھے۔ عہد بنی امیہ میں ہی ذی شعور لوگوں نے ان شاعرانہ باتوں کو غلط قرار دینا شروع کر دیا تھا۔ کسی اور مقام پر، ہمیں پہلی صدی ہجری کی بہت سی طنز آمیز اور مخالفانہ باتیں ملیں گی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنیت بدل رہی تھی (MUH- STUD جلد ۱ صفحہ ۳۲ ذیلی حاشیے)۔ خود فرزدق نے اس طریقۂ کار کو مضحکہ خیز بتایا ہے۔ (ملاحظہ ہو:۔ فرزدق، جریر اور جمیل کی رائے عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری کی بابت۔ الاغانی جلد ۴ صفحات ۱۳۳ اور ۱۴۴۔ ابن قتیبہ، تصحیح دی خویہ صفحہ ۳۵۰) شاعر عبیداللہ بن قیس الرقیات نے جو خلیفہ عبدالملک کا ہم عصر تھا، سعید بن المسیب کا طنزیہ فقرہ سُنا جو انھوں نے کھنڈرات کے سامنے کھڑے ہوکر شعراء کے بارے میں

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

عہد بنی عباس بنیادی نقطۂ نظر سے ایک تعمیری زمانہ ہے۔ اس عہد کی ابتدا میں ہم فتوحات اور توسیعات کی باتوں سے آزاد معلوم ہوتے ہیں۔ فاتحانہ جذبہ ٹھنڈا پڑتا جاتا ہے اور بادیہ نشین عرب اپنی رضا و رغبت سے قدیم طرز معاشرت کو خیرباد کہتے ہیں اور شہری زندگی کی آسائشوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ فوجیوں کی طرح شعراء بھی نفس پرستی کرتے ہیں، اب وہ جنگ اور قصاص کی بات نہیں کرتے بلکہ اہلِ دربار نظر آتے ہیں۔ اب وہ خلفاء اور امراء کی شان میں مدحیہ قصائد لکھتے ہیں اور انعامات حاصل کرتے ہیں۔ ان کے قصائد میں طرز قدماء ہوتا ہے مگر منظر کشی میں اگلی سی بات نہیں ہوتی۔ اس خمیازے کو انھوں نے بندشِ الفاظ، چستی محاورات اور اسلوب نگاری، ظرافت اور ضلع جگت سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ بسا اوقات وہ کسی جنگ کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں جو انھوں نے کبھی نہیں لڑی، کبھی کبھار وہ گھوڑے کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہیں، جس کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اور بعض اوقات بادو باراں کا وصف کرنے لگتے ہیں، جس کا سامنا انھیں کبھی نہ ہوا۔

(گزشتہ صفحے کا حاشیہ)
کہا تھا، عہدِ بنی امیہ کی ایک گمنام نظم جو بہت عام ہو گئی تھی اور جو معبد نے ولید بن یزید کے سامنے پڑھی تھی، یہ ہے :- (اغانی، جلد ا، سطور ۲۱ تا ۲۴)

"وہ حیرت زدہ ہوئی جب اس نے دیکھا کہ میں اس جگہ پر نوحہ اور گریہ کر رہا ہوں جو برسوں ہوئے ویران ہے۔ میں کھڑے رہ کر اس جگہ رو رہا ہوں جہاں میری آنکھوں کے سامنے سوائے ویران آثار کے کچھ نہیں ہے، وہ کہنے لگی کہ تو ان لوگوں پر کیوں روتا ہے جو سفر کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ جب کبھی تو کہتا ہے کہ وہ اب مقیم رہیں گے تو وہ کوچ کرنے کی ندا دینے لگ جاتے ہیں"

ہم بعد ازاں دیکھیں گے کہ شعراء بنی عباس نے قدیم بادیہ نشینوں کی شاعری سے کیسے پیچھا چھڑایا۔

اُن کی نظموں میں احساسات کا وہ وفور نہیں کہ جو جاہلیت کے شعراء کا مابہ الامتیاز وصف ہے، ان میں صرف لفظوں کی فن کارانہ بھرمار ہے، جس میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی وہ صرف انشاء پردازی ہے۔ اگلے وقتوں میں شاعر وہی ہوسکتا تھا جس کا ذہن تخیل کی رو سے گویا آتش فشاں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اب جب کہ علم عروض کے قوانین مرتب ہوگئے تو ہر شخص نے کاغذ اور قلم اٹھایا اور اوزان کی تقطیع شروع کردی اور قافیہ سنجی میں مشغول ہوگیا تاکہ ایک مکمل اور مرصع نظم لکھ سکے۔ قدیم شاعری کا موضوع مہمان نوازی، بہادری اور اپنی محبوبہ کا حسن و جمال ہوا کرتا تھا۔ اس میں اسلام کے اولین شعراء نے خدا کی حمد اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور صحابہ کرامؓ کی منقبت کا اضافہ کیا۔ عہد بنی عباس میں یونانی علوم اور فلسفہ نے شاعری کا میدان اور وسیع کردیا اور علم عروض، علم نجوم، فقہ، ریاضیات، کیمیا اور صرف و نحو بھی شاعری کے موضوعات بن گئے[1]

حالات کے ساتھ تغیر اور تبدل لازمی ہے۔ ہر زمانے کی شاعری معاشرہ کے حالات اور ماحول کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ چنانچہ قصیدہ ایک ایسی صنف شاعری تھی جو مقبول عام تھی، لیکن اب نئے حالات اس کے لیے سازگار نہ تھے، اسی لیے ان شعراء کو جو بدلے ہوئے حالات کو نظرانداز کیا کرتے تھے اور پرانی رٹ لگایا کرتے تھے، فوراً حقیقی حالات سے متنبہ کردیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ابوتمام شاعر کی ٹانگ کھینچی گئی جب اس نے احمد بن المعتصم کو سرداران عرب سے تشبیہ دیتے ہوئے یہ شعر کہا[2]

۱؎ ڈاکٹر ویل DIE POETISCHE LITERATUR der ARABER صفحات ۸۲ تا ۸۴

۲؎ ابن خلکان: مترجمہ دی سلین جلد ا صفحہ ۳۵۰ اور اس کے بعد، مزید ملاحظہ ہو:- پروفیسر نکلسن: ادبی تاریخ صفحہ ۲۸۸

عہد عباسیہ میں لوگوں میں حکمراں طبقہ کے مزاج کے مطابق کافی تبدیلیاں آنے لگیں۔ خلیفہ عبدالملک نے تو ابن قیس الرقیات کو برا بھلا کہا جب اس نے خلیفہ کی مدح میں ایرانی بادشاہوں کی خوبیاں بیان کیں مثلاً "تاج" (اغانی جلد ۴ صفحہ ۱۵۸) لیکن ابن المعتز نے اپنے ارجوزہ میں اپنے چچازاد بھائی کی تشبیہ ایرانی اردشیر سے کی ہے جب کہ اس نے ایک کھوئی ہوئی سلطنت پر واپس قبضہ جمایا (دیوان صفحہ ۱۲۸ سطر ۱۵) بے شک یہ ایرانیوں کا اثر و نفوذ تھا۔ اس کتاب کے آخری باب میں ہم دیکھیں گے کہ بنو عباس ایرانیوں سے کس قدر متاثر ہوچکے تھے۔

اقدام عمرو فی سماحة حاتم   فی حلم احنف فی ذکاء ایاس

یعنی اس میں عمرو کی سی دلیری ہے اور حاتم کی سی سخاوت ہے۔ اس میں احنف والی بُردباری ہے اور ایاس کی تیز فہمی ہے۔

ابو تمام نے بھی فوراً یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی ؎

لا تنکروا ضربي له من دونه   مثلاً شروداً فی الندی و الباس

فاللہ قد ضرب الاقل لنوره   مثلاً من المشکوٰة و النبراس

یعنی اگر میں نے ممدوح کی فیاضی اور جانبازی کی مثال گھٹیا لوگوں سے دی ہے تو مجھ پر اعتراض کرتے ہو، اللہ جلّ شانہٗ نے بھی اپنے نور کی مثال فانوس اور چراغ جیسی معمولی چیزوں سے دی ہے۔

ہسپانوی ادیب ابن بسام نے اندلس کی شاعری میں تبدیلیوں کے متعلق تبصرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ "جلتی ہوئی ریت پر خولہ کے خیموں کے آثار بہت مٹ چکے ہیں اور اب ان کی یاد میں کچھ کہنا گراں معلوم ہے۔" اس کے خیال کے متعلق اگر بار بار یہ کہا جائے کہ "دوستو! ٹھہرو، دو آنسو بہا لینے دو" تو یہ بے اثر معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ "کیا یہ ام اوفی دہی کی نشانی ہے؟" کون کہہ سکتا ہے کہ صدیوں کے بعد بھی صحرا میں چلنے والی ہواؤں نے اس کا نشان باقی رکھا ہوگا۔ برعکس اس کے اس کا خیال ہے کہ شاعری کے لیے اور میدان بھی ہیں جنھیں قدماء نے چھوا تک نہیں ہے اور بہت سے پاکیزہ خیالات اور خوش گوار مناظر ہیں جو ہمیں اپنے وقت کے موسم بہار اور موسم گرما میں ملتے ہیں اور ہم ان کو اُن پرانے نغمات پر ترجیح دے سکتے ہیں، جن کے بنانے والے عرصۂ دراز پہلے اس دُنیا سے کوچ کر گئے ہیں[1]

---

[1] یہ پوری عبارت EMMANUEL DEUTSCH کی کتاب "ادبی آثار" سے لی گئی ہے اس مصنف نے SHACK کی کتاب موسوم بہ "POESIE und KUNST der ARABER in SPANIEN und SICILIEN" صفحہ ۹ سے ترجمہ کیا ہے SHACK نے بھی یہ روایت DOZY کی تصحیح کردہ کتاب "LOCI DE ABBADIDES" صفحہ ۵۸ جلد سوم سے لی ہے۔

ابن بسام کی یہ رائے عہدِ بنی عباس کے شعراء کے بارے میں بالکل درست معلوم ہوتی ہے کیوں کہ انھوں نے خود کو قدیم روایات کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب سے پہلا شخص جو اس کفر کو توڑتا ہے وہ مطیع بن ایاس ہے، وہ اپنے قصائد میں روایتی تشبیب نہیں لاتا اُس کے ہم عصر شعراء نے قدیم روایات کا دامن نہیں چھوڑا [۱]۔ لیکن مطیع نے اپنی چھوٹی بحروں میں اشعار کہہ کر دلوں میں رقت پیدا کی جو اس کے ہم عصروں کے اشعار میں ناپید ہے۔ اس کے بعد بشّار (متوفی ۱۶۷ھ مطابق ۷۸۳ء)، ابونواس (متوفی ۱۹۹ھ)، ابن الرومی (متوفی ۲۸۳ء) اور ابن المعتز (متوفی ۲۹۶ھ) آئے اور انھوں نے پرانی روایات سے اور زیادہ دور رہنے کی کوشش کی۔ چوتھی اور پانچویں صدی کے شعراء نے تو قدیم روایات سے بالکل لاتعلقی پیدا کرلی۔ انھوں نے سبز لہلہاتے ہوئے باغات کا، گلہائے رنگا رنگ کا، نرگس کا، چہچہاتے ہوئے پرندوں کا، صاف شفاف پانی کے چشموں کا، جن میں چاند اور ستاروں کا عکس نظر آتا ہے، ساقی اور پیالے کا، برف سے ڈھکے ہوئے میدان کا اور دوسرے قدرتی مناظر کا چرچا کیا۔ ہم پانچویں باب میں عربی شاعری کے اس پہلو پر ان شاء اللہ گفتگو کریں گے۔

قصیدے میں سب سے بڑا تغیر اور انقلاب آیا۔ شاعر کی محبوبہ اب عماری میں بیٹھ کر ایک نخلستان سے دوسرے نخلستان تک نہیں جاتی تھی بلکہ وہ تو شہروں کا یکے بعد دیگرے کشتی میں سفر کرتی تھی یا کسی اور سواری سے جاتی تھی۔ مسلم بن الولید (متوفی ۲۰۸ھ مطابق ۸۲۳ء) نے اپنے قصیدے میں محبوبہ کے ویران خیمے سے خطاب نہیں کیا۔ وہ تو دریائے فرات سے پوچھتا ہے کہ محبوبہ کدھر گئی؟ [۲]

یا لیت ماءَ الفراتِ یخبرنا   این تولّت باھلھا السفن

ما احسن الموتَ عند فرقتھم   واقبح العیشَ بعد ماظعنوا

(یعنی کاش فرات کا پانی مجھے بتائے کہ "کشتیاں اپنی سواریوں کو کدھر لے گئیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ جدائی کے وقت موت آجاتی۔ اب زندگی کتنی تلخ لگتی ہے جب کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہیں۔")

---

[۱] بروکلمان: GESCH. DER AR. LITERATUR (مختصر چھاپہ) صفحہ ۴۱ [۲] دیوان: تصحیح دی خویہ۔ قصیدہ ۲۱

مغنی اسحاق الموصلی (۷۶۷ تا ۸۴۹ء) کہتا ہے[1]

ماکنت اعلم مافی البین من حزن حتی تنادوا بان قد جیئ بالسفن

(میں جدائی کے غم سے ناآشنا تھا، تا آنکہ انھوں نے ندا کی کہ "کشتیاں حاضر ہیں") -

قامت تودعنی والعین تغلبہا فجمجمت بعض ماقالت ولم تبن

(محبوبہ اٹھی اور روتی ہوئی مجھے الوداع کہنے لگی - وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر اس کی آواز گلو گیر تھی)۔

مالت الی تقدینی و ترشفنی کما یمیل نسیم الریح بالغصن

(وہ مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے ایسے جھکی جیسے شاخیں ہواؤں سے جھک جاتی ہیں اور مجھے بوسہ دے کر کہنے لگی کہ "میں تم پر نثار ہو جاؤں")

واعرضت ثم قالت وھی باکیۃ یا لیت معرفتی ایاک لم تکن

(پھر ایک طرف ہوکر روتی ہوئی کہتی تھی "کاش ہم دونوں کے دلوں میں چراغ آشنائی روشن نہ ہوتا")

شعراء اب اونٹوں پر سواری کرنے کے بدلے خود پا پیادہ سفر کرتے تھے اور اپنی جوتیوں کو اونٹنی سے تشبیہ دیتے تھے جو کبھی بھاگی نہ تھی اور جس نے کبھی بھی اپنے بچے پر بلبلایا نہیں تھا اور نہ کبھی اس پر کول تار لگایا گیا تھا[2]

سب سے پہلے ابونواس (۱۴۵ تا ۱۹۹ھ) کے اشعار میں ہمیں قدماء کے خلاف صدائے احتجاج ملتی ہے - وہ کہتا ہے[3]

صفۃ الطلول بلاغۃ القدم

فاجعل صفاتک لابنۃ الکرم

(یعنی کھنڈرات کو بیان کرنا کند ذہن لوگوں کا کام ہے، تجھے دختِ رز سے دل لگانا چاہیے اور اس کا بیان تیرا مقصد ہونا چاہیے -

---

[1] اغانی - جلد ۵ صفحہ ۱۲۰

[2] موازنۂ اشعارِ ابونواس اور متنبی - العمدہ - جلد ۱ صفحہ ۱۵۲

[3] العمدہ - جلد ۱، صفحہ ۵۸ -

خلیفہ ہارون الرشید نے اس کو دھمکی دی کہ اگر اس نے کہنہ آثار کی وصف سے گریز کیا تو وہ اُسے قید میں بند کردیں گے لیکن اس نے بے دھڑک خمریات کہنا جاری رکھا[۱] اس نے اپنے قصیدوں میں بادیہ نشینوں کی عشقیہ شاعری کا مذاق اڑایا ہے اور صحرانشینوں کی زندگی پر پھبتیاں کسی ہیں :-

"جنوبی ہوا سے کہو کہ وہ ویران مقام پر بارش برسائے
اور زمانے سے کہو کہ سرسبز و شاداب مقام کو برباد کردے
شتر سوار کو ریگستان سے نکالو
جہاں اچھی نسلوں کے اُونٹ تیز بھاگتے ہیں
جہاں خاردار اور جنگلی درخت اُگتے ہیں
اور جہاں بھیڑیوں اور گینڈے کا شکار کرنا آسان ہے " [۲]

یا پھر :-

"کوئی رنجور خاطر شاعر کسی ویران خیمہ گاہ پر کھڑا رہ کر اس سے پُوچھتا ہے، لیکن میں تو کسی شراب کی مقامی دکان پر کھڑا رہتا ہوں اور اس سے پُوچھتا ہوں"

---

[۱] شاید مندرجہ ذیل دو اشعار میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے (دیوان : تصحیح Ahlwardt صفحہ ۲ قصیدہ ۳۴) :-

دعانی الی صفة الطلول مسلّط	تضیق ذراعی ان اجوز له امرا
فسمعاً امیرالمؤمنین وطاعةً	وان کنتَ قد کلّفتنی مرکبا وعرا

یعنی حاکم نے مجھے حکم دیا کہ میں کھنڈرات کا وصف کروں لیکن ایسا کرنے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اے امیرالمؤمنین ! آپ کا حکم میرے سرآنکھوں پر ! آپ نے مجھے ایسے گھوڑے پر سواری کرنے کو کہا ہے جو قابو سے باہر ہے۔

[۲] دیوان : تصحیح Ahlwardt صفحہ ۸۔ ترجمہ از پروفیسر نکلسن : مشرقی نظم و نثر صفحہ ۲۹۔

"خدا کرے پتھروں پر رونے والی آنکھوں کے آنسو کبھی خشک نہ ہوں اور
اس دل کو سکون نہ ملے جو خیموں کی کیلوں پر آہ وزاری کرتا ہے"
"انھوں نے دریافت کیا کہ آیا تو نے بنو اسد کے خیموں کی یاد تازہ کی ہے،
ارے خانہ خراب! مجھے بتا کہ یہ بنی اسد کون ہیں"
"اور تمیم اور قیس اور ان کے عزیز واقارب کون ہیں؟ خدا کی نظر میں ان
بادیہ نشینوں کی کوئی حقیقت نہیں" [۱]

ذیل میں دیئے ہوئے معرّی کے اشعار بھی اسی قسم کے ہیں[۲]:-

"خدا مجھے بخشے! میں خیموں کے آثار پر خاموش ویرانے میں نہیں روتا
ہوں جس طرح کہ توأم اگلے زمانے میں رویا کرتا تھا"[۳]
"کیا سُمسُم کے ویرانے کو معلوم ہے کہ ماضی میں العجّاج وہاں ٹھہرا تھا"
"اے بندۂ خاکی کو الہام بخشنے والے خُدا! میں کاروانوں کے پیچھے پیچھے
نہیں جاؤں گا جو مَلہَم کی کھجوریوں کے مانند ہیں"

عہد بنی عباس کی شاعری کی دُوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نادر اور مبہم عبارتیں نسبتاً کم ہیں جو علم وفضل والے شعراء بہت پسند کیا کرتے تھے۔ ابوالعتاہیہ اور السیّد الحمیری دونوں نے ورڈزورتھ کے مانند کہا ہے کہ شعر وسخن کی زبان عام فہم ہونی چاہیے تاکہ ہر کس وناکس سمجھ پائے[۴] اسلام میں فلسفیانہ شاعری کا آغاز بھی ابوالعتاہیہ سے ہوتا ہے، جس کا حامی بعد میں ابوالعلاء المعرّی (۳۶۳ تا ۴۴۹ھ) ہوا۔ ابوالعتاہیہ نے ذیل کا شعر اپنے اکلوتے بیٹے کی

---

[۱] پروفیسر نکلسن: مشرقی نظم ونثر صفحہ ۲۳ اور گولڈزیہر: Alte u. Neue Poesie صفحہ ۱۲۵-

[۲] سقط الزمن: جلد ۲ صفحہ ۱۵۵ اور گولڈزیہر: Alte u. Neue Poesie صفحہ ۱۴۷-

[۳] توأم بن الحارث الیشکری اور امرؤالقیس دونوں ہم عصر تھے۔ توأم نے امرؤالقیس سے شاعرانہ مقابلہ کیا تھا، اس کے اشعار کھنڈرات کے وصف میں بہت مشہور ہیں-

[۴] اغانی: جلد ۳ صفحہ ۱۶۱ اور جلد ۷ صفحہ ۱۱ بالترتیب

موت پر کہا ہے ؎

و كانت في حياتك لي عظات وانت اليوم اوعظ منك حيًا

یعنی تیری زندگی میں میرے لیے کئی سبق تھے، لیکن آج تو زیادہ سبق دے رہا ہے بہ نسبت اُس وقت کے کہ تو زندہ تھا۔

یہاں ابوالعتاہیہ وہی بات کہہ رہا ہے جو ایک یونانی فلسفی نے سکندر کی لاش پر کہی تھی :

"جب تک یہ شخص زندہ تھا، اس کی باتیں ہمارے لیے سبق آموز تھیں، لیکن آج اس کی خاموشی پہلے سے زیادہ عبرت ناک ہے" [۵۱]

ابُوالعتاہیہ، ابوتمام اور المتنبّی کے اشعار حکمت و دانش سے بھرے پڑے ہیں، اسی وجہ سے الحاتمی نے ایک رسالہ لکھا، جس میں متنبّی کے ایسے اشعار ہیں جو بقول اس کے ارسطو سے ماخوذ ہیں۔ یہاں ایک مثال کا دینا کافی ہوگا۔ ارسطو نے کہا تھا [۵۲]:

"اذا كانت الشهوة فوق القدرة كان هلاك الجسم دون بلوغ الشهوة - (یعنی جب شہوت، طاقت سے زیادہ ہو تو شہوت پُوری ہونے سے پہلے جسم ہلاک ہوجاتا ہے)۔"

---

[۵۱] العسکری: کتاب الصناعتین، صفحہ ۱۱ اور العمدة، جلد ۲ صفحہ ۲۲۵۔ ابن رشیق نے ان الفاظ کو ارسطو کی زبان سے دہرایا ہے۔ ہندوستان کے فارسی شاعر امیر خسرو نے اس خیال کو اپنی والدہ کی وفات پر ایک مرثیے میں ادا کیا ہے ؎

روزیکه لب تو در سخن بود پند تو صلاح کار من بود
امروز منم بمهر پیوند خاموشی تو همی دهد پند

(جب کبھی تیرے ہونٹ ہلتے تھے تو تو میرے فائدے کی بات کہتی تھی، آج میرے لبوں پر مہرِ سکوت ہے اور تیری خاموشی مجھے بہت کچھ کہہ رہی ہے) ۔ (پروفیسر براؤن: تاریخ ادبیات ایران جلد ۳ صفحہ ۱۱۱)

[۵۲] الرسالة الحاتمیہ: التحفة البهیة کا صفحہ ۱۴۵۔

اس خیال کو متنبی نے یوں ادا کیا ہے ؎

واذا کانت النفوس کباراً　　　　تعبت فی مرادھا الاجسام

یعنی جب حوصلے بڑے ہوتے ہیں تو ان کے مطابق عمل کرنے میں جسم تھک جاتے ہیں۔

شعر وسخن میں ان تغیرات کے آنے اور قدیم طرز کو خیرباد کہنے کے علاوہ بہت سے نئے خیالات اور شاعرانہ نکات پائے جاتے ہیں۔ ابن رشیق نے ایک پورا باب اس بارے میں لکھا ہے[1] اس کا استدلال یہ ہے کہ ان نئے خیالات کا وجود، عربوں کی اجتماعی زندگی میں انقلاب آنے کی وجہ سے تھا۔ عرب چاروں طرف پھیل چکے تھے اور انھیں مختلف ثقافتوں سے سابقہ پڑا تھا، لہٰذا ان کی شاعری میں بھی انقلاب کا آنا لازمی تھا۔ مزید برآں وہ کہتا ہے کہ قدماء بھی ان باتوں سے مستثنیٰ نہیں تھے درحقیقت انھوں نے آنے والے شاعروں کے لیے راہ ہموار کی تھی۔

اگر ہم جریر، فرزدق وغیرہ کی جدت طرازیوں کو دیکھیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے کیسی کیسی نئی ترکیبیں اور کیسے کیسے نئے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بشار اور اس کے ہم نوا شعراء نے اس میں توسیع کی اور مزید نئے خیالات اور نادر تشبیہات کا سہارا لیا جن کا متقدمین کو خواب وخیال نہ تھا۔ مثلاً بشار کہتا ہے[2] ؎

---

[1] العمدۃ، جلد ۲ صفحہ ۱۸۵

[2] اغانی۔ جلد ۳ صفحہ ۳۳۔ اسی تشبیہ کی بنا پر ایرانی شاعر عمارہ کہتا ہے ؎

اندر غزل خویش نہاں خواہم گشت　　　　تا بر لب تو بوسہ زنم چونش بخوانی

یعنی میں اپنی غزل میں پوشیدہ رہوں گا تا آنکہ تو اسے پڑھے تو میں تیرے ہونٹوں کا بوسہ لوں۔ (جامی: بہارستان، صفحہ ۸۴ اور جیکسن: قدیم ایرانی شاعری صفحہ ۵۲ اور دوسرے مصادر جو ذیلی حاشیہ ۲ میں مذکور ہیں)

خفاف نے اسی کو بڑھا چڑھا کر کہا ہے ؎ (لغات فرس تصحیح پال ہارن۔ صفحہ ۸۰)

شکی سیدی من آن بتمی!　　　　تا چو بتخالہ گرد آن لبمی،

یعنی کاش میرے آقا (محبوب) کو بخار چڑھتا، تاکہ میں اس کے ہونٹ پر آبلہ ہوتا۔

یا لیتنی کنتُ تفّاحاً مفلّجۃ او کنتُ من قضب الریحان ریحانا

(کاش میں ایک سیب ہوتا جس کے دو ٹکڑے کیے جاتے ہیں یا کاش میں نازبُو کی ٹہنی پر ایک پھول ہوتا)

حتی اذا وجدت ریحی واعجبہا ونحن فی خلوۃ مثلت انسانا

(تاکہ جب وہ اُسے سُونگھتی اور اُسے وہ خوشبو اچھی لگتی اور وہاں کوئی نہ ہوتا تو میں ایک انسان کی شکل میں نمودار ہوجاتا)۔

ابن الرّومی میں اس قسم کی جدّت طرازیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ذیل کے دو اقتباسات وضاحت کے لیے کافی ہیں :۔

عینی لعینک حین تنظر مقتل ولکن عینك سہم حتف مرسل

من العجائب ان معنی واحدا ھہ منك سہم وھومنّی مقتل

(جب تو دیکھتی ہے تو میری آنکھ تیری آنکھ کا گھائل ہوجاتی ہے۔ تیری آنکھ کمان سے نکلا ہوا تیر ہے۔ عجیب بات ہے کہ معنیٰ کے لحاظ سے دونوں ایک ہی چیز ہیں، گرچہ تیری آنکھ تیر ہے اور میری آنکھ نشانہ ہے)[۵۱]

دُوسرے اقتباس میں اس بات کی وضاحت ہے کہ بچّہ پیدائش کے وقت کیوں روتا ہے[۵۲] ؎

لما توذن الدنیا بہ من صروفہا یکون بکاءُ الطفل ساعۃ یولد

(چونکہ زمانہ اپنی گردشِ حالات کو بتاتا ہے، اس وجہ سے بچہ اپنی پیدائش کے وقت روتا ہے)

والا فما یبکیہ منہا وانہا لافسح مما کان فیہ وارغد

(ورنہ وہ کیوں روئے؟ جس جگہ سے وہ آرہا ہے اُس سے تو یہ دنیا زیادہ وسیع اور نفع بخش ہے)

اذا ابصر الدنیا استہل کانہ بما سوف یلقی من اذاھا یھدّد

(جب وہ دُنیا کو دیکھتا ہے تو رونا شروع کردیتا ہے، گویا کہ وہ ان تکالیف سے ڈرایا جارہا ہے جن سے وہ دوچار ہوگا)

---

۵۱ العمدۃ، جلد ۲ صفحہ ۱۹ اور دیوان ابن الرومی: تصحیح جیلانی۔ صفحہ ۱۸۔

۵۲ دیوان ابن الرومی۔ صفحہ ۳۹۳

وللنفس احوال تظلّ کانّها تشاهد فیها کلّ غیب یشهد

(نفس انسان کے لیے کچھ ایسے حالات ہوتے ہیں جن سے وہ رازہائے دروں کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے)

اسی قسم کے چند اور اقتباسات کا ذکر پانچویں باب میں آئے گا، ان کے ساتھ فارسی کے ہمدوش اشعار بھی ہوں گے۔

عہد عباسیہ کی عربی شاعری کا یہ مختصر خاکہ ہے، اس سے ہم فارسی شاعری کے نشو و نما کے زمانے سے قریب ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد ہم نیا باب شروع کریں گے اور اس میں عربی شاعری کے ان نمونوں کو پیش کریں گے جنھیں ایرانیوں نے اپنانے کی کوشش کی تھی۔

(مسلسل)

إلهام الرحمٰن في تفسير القرآن

من أمالي

الأستاذ عبيد الله السندي

الجزء الثاني

قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ

شاہ ولی اللہ اکیڈمی * صدر * حیدر آباد * سندھ